ارشاد احمد حقانی

مولانا ندوی کی یاد میں

ممتاز عالمِ دین اور صاحبِ فکر و نظر اسکالر مولانا محمد حنیف ندوی کے سانحۂ ارتحال سے علمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ مولانا ندوی سے عقیدت و احترام کا تعلق اور رشتہ بہت پرانا ہے۔ ۱۹۴۴ء اور اس کے بعد کے سالوں میں جب میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ لاہور) کا طالب علم تھا، کالج کے احاطے میں واقع مسجد مبارک میں مولانا ندوی کا درسِ قرآن اور خطبۂ جمعہ سننے جایا کرتا تھا۔ اس دلچسپی اور مصروفیت میں میرے مستقل ساتھی ملک کے صاحبِ طرز اور مایہ ناز شاعر جناب عبدالعزیز خالد، جامعہ کراچی کے شعبہ صحافت کے موجودہ سربراہ پروفیسر زکریا ساجد اور لاہور کے ممتاز معالج اور سماجی کارکن ڈاکٹر محمد سلیم فاروقی تھے۔ ہم چاروں دوست بڑی باقاعدگی اور بڑے شوق سے مولانا کی مجلسِ درس میں شریک ہوتے ان کی سچی تلی، عالمانہ اور بصیرت افروز گفتگو سے کسبِ فیض کرتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے لیے عقیدت و احترام کے جو جذبات سولہ سترہ سال کی عمر میں قلب و ذہن میں ابھرے تھے اور ان میں جو ذہنی رشتہ اس وقت قائم ہوا تھا، وہ ساری عمر برقرار رہا۔

جناب عبدالعزیز خالد اب خود صرف ایک شاعر ہی نہیں، ایک وقیع علمی شخصیت کے مالک ہیں۔ لغت میں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے، اس سے تو اربابِ ادب و فن واقف ہی ہیں، ان کا تازہ ترین معرکۃ الآرا کارنامہ پورے قرآنِ حکیم کا منظوم ترجمہ ہے۔ میں اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے باوصف جس قدر اس منظوم ترجمۂ قرآن کو سمجھ سکا ہوں، مجھے یہ علمی اور شعری لحاظ سے خالد کا ایک شاہکار محسوس ہوتا ہے۔ اس بلند علمی مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود خالد صاحب سے جب بھی مولانا ندوی کے بارے میں بات ہوئی ہے، انھیں ان کی وجاہتِ علمی اور ان کی فکری بصیرت کا تذکرہ اسی عقیدت اور احترام سے کرتے پایا ہے، جس سے ہم اُن کا ذکر اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ یہ گویا اس حقیقت کا اعتراف اور اس امر واقعہ کا اثبات ہے کہ مولانا ندوی ایسے بلند علمی مقام پر فائز تھے کہ

جو لوگ علمی دُنیا میں اپنا ایک قائم بالذات مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، وہ بھی ان کی علمی سیادت و ریاست کے معترف اور قائل ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی سے عقیدت و احترام کا تعلق جیسا کہ میں نے عرض کیا، طالب علمی کے زمانے ہی میں قائم ہو گیا تھا لیکن بعد کی زندگی میں زیادہ ربط و ضبط اس وجہ سے بھی نہ رہا کہ میں تعلیم سے فراغت کے بعد جماعتِ اسلامی میں چلا گیا اور زندگی کا اوڑھنا بچھونا جماعتی کام ہی بن گیا۔ جماعت سے جب تعلق ٹوٹا تو میں نے درس و تدریس کی دنیا میں گوشۂ عافیت تلاش کیا۔ اس دوران لاہور میں میرا باقاعدہ قیام بہت ہی کم رہا۔ صحافتی کام، بالخصوص اداریہ نویسی، میں گھر پر بیٹھ کر ہی کرتا رہا۔ اس زمانے میں مولانا کی تحریریں تو نظر سے گزرتی رہیں لیکن ملاقاتیں صرف گاہے ماہے ہی ممکن ہو سکیں۔ "جنگ" میں آمد کے بعد ایک طرح سے تجدیدِ تعلقات ہوئی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ان کے دیرینہ رفیق اور عمر بھر کے ساتھی مولانا محمد اسحاق بھٹی جو خود بھی ایک روشن ضمیر اور صاحبِ نظر عالم دین ہیں، اکثر رابطہ کا کام دیتے۔ وہ دفتر "جنگ" تشریف لاتے یا کہیں اور ملاقات ہوتی تو ان سے مولانا کی خیریت معلوم ہو جاتی۔ ندوی صاحب نے اپنی ایک دو تازہ تصانیف بھی اپنے دستخطوں کے ساتھ عطا فرمائیں۔

میرے چین جانے سے کوئی تین چار ہفتہ پہلے مولانا کے ایک نوجوان عزیز کا خط ملا کہ مولانا شدید علالت کی گرفت میں ہیں۔ ان کے بیرونِ ملک علاج کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے جس کی استطاعت مولانا کے پاس نہیں۔ میں نے اس عزیز کو جوابی خط لکھا کہ آپ مجھے مزید معلومات فراہم کر سکیں تو میرے لیے مؤثر طور پر مولانا کی امداد کی تحریک کرنا ممکن ہو سکے گا۔ اس پر ان کا فون آیا کہ میں آپ سے کب اور کہاں ملاقات کروں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے لیے ۱۴ جون کی صبح کو اسلام آباد جا رہا ہوں واپسی پر ملاقات ہو گی۔ لیکن وہ نوجوان مولانا کے ایک صاحب زادے کو ساتھ لے کر ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں میں نے ان سے مولانا کی علالت کی تفصیل سنی اور دوسرے حالات دریافت کیے اور وعدہ کیا کہ میں اسلام آباد سے واپسی پر کچھ لکھوں گا۔ اسلام آباد میں قیام کا پروگرام پہلے صرف تین دن کا تھا جو پانچ چھ روز پر پھیل گیا۔ واپس آتے کے اگلے ہی روز پھر جانا پڑ گیا۔ اس طرح تاخیر ہوتی گئی اور مولانا کی علالت کے حوالے سے کالم لکھنا ممکن نہ ہوا۔ اس کے متصلاً بعد میں چین چلا گیا۔ واپسی پر سفر نامہ کی چند اقساط لکھ کر کچھ فرصت ملی تھی اور ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مولانا کی حالت اور حالات کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کروں کہ ان کی رحلت کی

خبر آگئی۔

حضرت مولانا کو تو اپنے وقت پر جانا ہی تھا۔ علاج معالجہ کہیں بھی ہوتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن دل میں یہ حسرت رہ گئی کہ ان کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ اصل میں مجھے ان کی شدید اور پیچیدہ علالت کی اطلاع اس وقت ملی جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور میری یا کسی دوسرے کی اپیل پر انھیں بیرونِ ملک لے جانے کا بندوبست ہو بھی جاتا تو افاقہ اور صحت یابی کا امکان نہ رہا تھا۔ ان کی وفات کینسر سے ہوئی ہے اور ان کے عزیزتے جو خود بھی ایک ڈاکٹر ہیں، جب لاہور ایئر پورٹ پر مجھے ان کی بیماری کی پیچیدگیوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تک قطعی تشخیص نہیں ہو سکی، تو مجھے اسی وقت اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مرض تشویش ناک ہے اور آخر کار یہی ظاہر ہوا کہ انھیں محض سوءِ ہضم کی تکلیف نہیں تھی، معاملہ زیادہ سنگین تھا۔

مولانا ندوی اپنی حیاتِ مستعار کی مہلت مکمل کر کے اپنے رب کے حضور جا چکے ہیں۔ یہ مرحلہ آج نہ آتا تو کل آجاتا۔ لیکن مولانا یقیناً ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگیاں اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی خدمت میں گزرتی ہیں۔ مولانا ندوی نے ساری عمر وعظ و تلقین، درس و تدریس، تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ حدیث، تفسیر، فقہ، فلسفہ، تاریخ، منطق اور علم الکلام پر ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ بہت کم لوگ ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مولانا کی دو درجن سے زائد کتابیں جن میں ان کی تفسیر قرآن اور نامکمل لغات القرآن بھی شامل ہیں، ایک ایسا قیمتی علمی سرمایہ ہیں جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا اگرچہ روایتی علما کی صف کے آدمی تھے، لیکن انھیں ندوۃ العلما کے بہترین فرزندوں میں شمار کیا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ ندوۃ العلما علم و حکمت اور دین و تفقہ کے دوائر میں جن روایات کا امین اور مظہر سمجھا جاتا ہے، مولانا محمد حنیف ندوی ان کے ممتاز ترین علم بردار تھے۔ امورِ دینی میں عمق، رفعت، ادراک اور بصیرت کی خصوصیات ان کا طرۂ امتیاز تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دینی تعلیمات کے حوالے سے بعض قدامت پرست مذہبی حلقے مولانا ندوی کی آرا سے اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن ہمارا یقین ہے کہ اکثر اختلافی مسائل میں مولانا ندوی کی رائے صائب اور حقائق سے قریب تر تھی۔ مولانا جدید فلسفہ اور معاصر معاشرتی و عمرانی علوم سے پوری طرح واقف تھے، ان پر ان کی گہری اور ماہرانہ نظر تھی۔ میں مولانا کو "راسخون فی العلم" کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی کتب "اساسیات اسلام"، "مسئلہ اجتہاد"، ان کی تفسیر قرآن دین کی بنیادی تعلیمات کے حوالے سے ان کی گہری بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور عمرانی مسائل پر اسلام کے حوالے سے جس طرح انھوں نے روشنی ڈالی ہے، اس میں دورِ جدید

میں اسلام کے طالب علموں کے لیے مطالعہ اور غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔

مقام افسوس ہے کہ اتنا بڑا عالم اور بے مثال اسکالر ساری عمر لکھنے پڑھنے کا کام کرنے، اسّی سال سال کی عمر تک پہنچنے اور آخر دن تک پتہ ماری کرتے رہنے کے باوجود اس قابل نہ ہو سکا کہ اپنی شدید علالت کا حسبِ منشا علاج کروا سکتا۔ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کی وجہ سے بہت دیر تک انھوں نے کسی سے رابطہ بھی قائم نہ کیا کہ ان کے لیے علاج معالجہ کی مطلوبہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ اپنی رحلت کے وقت مولانا کرائے کے مکان میں قیام پذیر تھے اور تھوڑا ہی عرصہ قبل بیماری کی حالت میں انہیں کرائے کے ہی ایک دوسرے مکان سے یہاں منتقل ہونا پڑا تھا۔

جس معاشرے میں مولانا محمد حنیف ندوی کے پائے اور علمی وجاہت کا حامل انسان اسّی سال کی عمر تک کام کر کے بھی کرائے کے مکان میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرے، اس کی بے حسی اور بے حمیتی کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے، کم ہے۔ میرے علم کے مطابق مولانا کے دو بیٹے بھی جسمانی لحاظ سے معذور ہیں۔ ایک کی حالت تو انتہائی قابلِ رحم ہے۔ وہ جسمانی معذوری کے باوجود ایک معمولی ملازمت کرنے پر مجبور ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی میں اپنے ان حالات کا تذکرہ کسی کے جذبۂ ترحم کو ابھارنے کے لیے کبھی نہیں کیا اور مجھے بھی پسند نہیں کہ میں ایک بالغ نظر اور خوددار عالم کی وفات کے بعد بھی ان واقعات کا تذکرہ کروں۔ مجھے خود ایسا کرتے وقت شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن اجتماعی مصالح کی خاطر بعض باتیں ناپسند ہونے کے باوجود کرنی پڑتی ہیں۔

کیا آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اتنا وقیع اور بلند پایہ اور اتنا طویل علمی کام کرنے والی کوئی شخصیت اس قسم کے مالی اور معاشرتی حالات سے دوچار ہو سکتی ہے؟ مولانا کے انفرادی کیس سے ہٹ کر ہمیں اس سوال پر غور کرنا چاہیے کہ اہلِ علم کی ناقدری کی اس قومی روش کا کیا علاج ہے؟ جو قوم اپنے مفکرین اور اسکالرز کو یوں کسمپرسی کے حوالے کر دیتی ہو، وہ کس طرح علمی و فکری میدان میں کثرت سے نئے چراغ جلنے کی توقع کر سکتی ہے؟ کاش ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور مادہ پرستی کی اندھی دوڑ میں مصروف رہنے کی بجائے قومی سطح پر علم اور اہلِ علم کی قدر کرنے کی بھی کوئی روایت قائم کریں۔

(جنگ، لاہور - ۱۷-جولائی ۱۹۸۷ء)